نمائندہ اردو ناول نگاروں کے تاریخی شعور کے ماخذات کی تفہیم ایک مطالعہ

مہرونہ لغاری۔ ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر انوار احمد۔ شعبہ اردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر روبینہ ترین۔ شعبہ اردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان

ABSTRACT:
In this article PhD research scholar has traced under the guidance of her supervisors, social and cultural and historical context which provided foundation to assess the level of consciousness, supression and hallowness [if any] in the writings of Master urdu novelists.These Novelists have portrayed the complexity of the situation in an individual level and as a society too on the bases of their own experiences.. From Qurat Ul Heider to Hassan Manzar Urdu novel has seen the bold pen and brush upon its convas being broadened by changing landscape.Treatment approach and outlook of the scholar is based upon historicity and post colonial vision. It is result of group research conducted under the PhD supervisors Dr.Anwaar Ahmad and Dr.Rubina Tareen leading to PhD degree in Urdu.

شعور انسان اور اس کے گرد و پیش میں پائے جانے والے واقعات کے درمیان باہمی ربط ضبط قائم کرنے کی ایک مخصوص کاوش کا نام ہے۔ یہ مختلف رنگوں کی پہچان کا عمل بھی ہے پہچان کا یہ عمل شعور تضاد کے سہارے طے کرتا ہے جب تک تمیز، تضاد یا فرق کا یہ عمل دو رنگوں، سیاہ و سفید، دو اقدار صحیح یا غلط، سچ یا جھوٹ، اندھرا یا اجالا کی سطح تک رہتا ہے معاشرہ لچک، لا محدود امکانات سے مبرا ہو کر تہی دست تہی داماں رہتا ہے، حبس اور گھٹن کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ سانس لینا اور بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا بھی کارِ محال لگتا ہے۔ لیکن جب یہی شعور لا محدود سطح پر آتا ہے تو انسانی اذہان تغیر پذیری کی مثال بنتے ہیں اور یہیں سے تاریخی، تہذیبی، مذہبی تناظرات بصیرت افروز معنی پیدا کرتے ہیں لفظ بصیرت کی بھی کئی تعبیرات اسی شعوری محرک کے تابع ہیں۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ اس وقت جو کچھ معاشرتی تنزل، مذہبی حسیت، مادی پسماندگی، اور فکری رجعت سے نجات کے لیے یا سماج کی درست سمت کے تعین کے لیے تہذیب و تاریخ، مذہب، معیشت سائنس اور ٹیکنالوجی سے رجوع کر لینا ہی کافی ہے؟ یا جسے دانشِ برہانی، داخلی بصیرت، تاریخی و تہذیبی شعور یا تاریخیت کا نام دیا جاتا وہ کچھ اور چیز ہے؟ جس کی طرف مسٹر چپس کے لازوال کردار نے اپنے متروک یا عنقریب متروک و مسترد قرار دیے جانے والے انگریزی نصاب کے چند پنوں پر مشتمل بظاہر بے ضرر لیکن حقیقت میں گہرا اور دیرپا چبھتا سوال اپنی طرز کے معصومانہ اور مذہبی انتہا پسندی کی طرف جاتے معاشرے کے نوخیز اذہان کے سامنے تب بھی رکھا تھا اور اب بھی اس سماج کے باشعور اذہان کو یاسیت اور واماندگی کے جس احساس

تلے چھوڑا ہے، وہی شعور دراصل سماج کے اندر خود تنقیدی کی ایسی احتسابی خوبی پیدا کرتا ہے کہ جہاں وسعتِ قلب، رواداری اور دوسرے کے احساسات کو سمجھنے اور سمجھانے کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ زیر بحث مقالے میں اردو ادب کے نمائندہ ناول نگاروں کے یہاں ان کی نگارشات میں اس تاریخی شعور کے محرکات وماخذات کا ایک مختصر سا جائزہ لینے کی کاوش کرنے سے قبل شعور کی چند متعینہ توضیحات پر ایک نظر ڈال لینا مناسب رہے گا۔

شعور اصل میں عقل (Mind) کی ایک ایسی کیفیت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں Subjectivity، Self awarness، دانائی اور آگاہی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں تاریخ کا علم ماضی کے اہم واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک طرح کی تاریخی تحقیق یا سوانحی تحقیق کے مماثل ہے جبکہ تاریخی شعور ایک بالکل مختلف نوعیت کی آگہی کا نام ہے۔ تاریخ کے اہم وقوعات/واقعات کا اس دور کے انسان کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور آج کا انسان اس سے متعلق کیا رویہ رکھتا ہے۔ تاریخی شعور انفرادی یا اجتماعی ہر دو سطح پر ماضی کی تفہیم ہے جو داخلی و خارجی، ذہنی و تہذیبی عوامل کو ایک نئی شکل میں متعارف کراتا ہے تاکہ ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے جوڑا جاسکے۔

تاریخ ایک ایسا طاقتور میڈیم ہے جس کی مدد سے موجودہ ادوار میں لوگوں کا طرز فکر موڑا بھی جاتا ہے اور انہیں گمراہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں ریاستی عناصر اور مقتدر ادارے شامل ہیں تاریخ ایک ایسا جبر کا آلہ بھی ہے جو لوگوں کو مطیع بنانے کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ یوں تو تاریخ سب لوگوں کی ہوتی ہے لیکن کسی بھی معاشرے کے مقتدر طبقات اس کی ترجمانی کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں یہ چند لوگ وہ ہیں جو قائدین کے طور پر اہلِ معاشرہ مقرر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ کا یہ شعور جو بیسویں صدی سے ہی عالمی جنگوں کے بعد حساس ترین اذہان ہی نہیں عام طور پر جامد اور ٹھس متصور ہونے والے دماغوں پر دستک دیتا رہا کہ ہمارا وجود کچھ مخصوص لوگوں کے خوابوں ، تلون مزاجی، اور خواہشوں کے تابع ہو چکا ہے جن کے اپنے کچھ جنگی نظریات دریافتیں اور انقلابی تصورات ہیں چاہیں نہ چاہیں آپکو ان کا حصہ بننا ہوگا، دنیا کی تمام آبادی کو یا تو جینا ہوگا یا مرنا پڑے گا۔

تاریخ یا مورخ کو معاشرے کے مقتدر طبقات نے اور بعد کے زمانوں میں، جمہوری اور عوامی حکمرانوں، نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اس لیے جدید عہد میں میڈیا اور نصاب کی کتابوں سے عوام کے شعور کو کنٹرول کیا گیا ۔تاریخ کو مختلف ادوار میں مختلف تناظرات سے لکھا گیا مثلاً کبھی سیاسی، مذہبی، معاشی اعتبارات سے لکھا گیا۔ کبھی اسے زمانی اعتبار سے پتھروں کا زمانہ، کانسی یا لوہے کا زمانہ، زرعی دور، صنعتی دور، یا انقلابات مثلاً روس و فرانس انقلاب، کبھی عالمی جنگوں کے تناظر میں اور کبھی قدیم و جدید ادوار میں تقسیم کر کے لکھا گیا، معاشرتی شعور کے فروغ کے بعد اس

رجحان پر زور دیا گیا کہ تاریخ کو سماجی زندگی کے آئینے میں دیکھا جائے اس کے لیے اُسے اپنے شعور کا ہونا ضروری ہے تاکہ سماج کا ہر وہ پہلو جو تاریخ کی حرکت میں اہم کردار ادا کرتا ہے اس کو بیان کیا جائے۔ پھر مارکس کے زیرِ اثر تاریخ کا اور پہلو جو سامنے آیا اس میں تاریخ کی حرکت کو پیداوار سے پیداواری رشتوں سے جوڑ دیا گیا۔

ان تمام مباحث پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد چونکہ اس مطالعہ میں پاکستانی ناول نگاروں کے یہاں تاریخی و تہذیبی شعور کے ماخذات کی دریافت مقصود ہے۔ اس لیے تہذیبی و تاریخی مباحث میں پاکستانی ادیبوں کے شعور کے اندر تہذیب و تاریخ سے ساتھ وابستہ تضادات یا تصورات کا جائزہ لینا کٹھن بھی ہے اور اہم بھی ہے۔ ان ناول نگاروں کے یہاں اپنی تخلیقات میں اپنی طرز کے مخصوص شعور کا جائزہ ان کی خانگی زندگی، ان کے عہد کے حالات انکے تجربات، ان کے مطالعہ کی دنیا سے مدد سمجھنے کی کاوش کی جائیگی۔ ان ادیبوں کے یہاں جو تاریخی شعور ہے اس کا تعلق اس صدیوں سے قطرہ قطرہ کشید ہونے والی مشترکہ ہند مسلم تاریخ و تہذیب کی وراثت سے ہے جسے اس خطہ کے بعض عناصر کی بدولت تضادات کا سامنا ہے۔

اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آصف فرخی لکھتے ہیں:

> ''ہم اپنی اساس پر بہت الجھاؤ کا شکار ہیں۔ آیا ہم اپنی شناخت کا آغاز اپنی مذہبی بنیاد پر کریں۔ یا اپنی مملکت کی زمینی اساس پر موہن جو دڑو کی رقاصہ ہماری ثقافت کا نقطہ آغاز ہے یا سندھ کے ساحل پر لنگر آزما ہونے والے عرب جہاز رانوں کی افواج؟ تکشیلا کے عجائب گھر میں لکھا ہوا مہاتما بدھ ہماری ثقافت کا جزو ہو سکتا ہے اور وہ شاعر ادیب جو تقسیم کے وقت سرحد کے اس پار رہ گئے؟ گویا ہم نے پرے کر رکھا ہے۔ یہ شناخت کے ایک پہلو کو قبول کرنے کا مطلب ہے باقی سب پر خطِ تنسیخ پھیر دینا۔ ہمارے ان رویوں کے خلاف نجیب محفوظ کا وہ رویہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد لمحہ افتخار میں اپنی تہذیبی دھاراؤں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ اور اپنی سرزمین کی روایت اور مذہبی روایت میں تضاد و تصادم کا شکار نہیں ہوتا۔''[۱] ہر معاشرے میں تہذیب اور کلچر کا سچا نمائندہ ادیبوں کا وہ طبقہ ہوتا ہے جس کے لیے تاریخی و تہذیبی تناظرات کے پیچھے جواز یا مقصد کی کافرمائی نہ تھی۔

بجا طور پر، ڈیوڈ سیپل نے ناول کو ایک ایسا فنی کارنامہ قرار دیا ہے جو ہمکو ایک زندہ دنیا سے متعارف کراتا ہے، حقیقی، سماجی اور تہذیبی پس منظر اور پیش منظر بھی ناول کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ ناول صرف واقعہ نگاری نہیں ہوتا بلکہ اپنے عہد کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور ناول کی کوئی بھی تاریخ تہذیب کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اکثر

ناول نگار ناول کے مرکزی موضوع خیال یا کردار سے اسقدر شدت سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ وہ ناول کی مکمل اور تخلیقی و تہذیبی فضا بنانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پریم چند سے لیکر قرۃ العین حیدر تک کے ناول کامیابی کا ایک بہت بڑا راز ان کے موضوعات کا تہذیبی اور سماجی پس منظر ہے جس کی تہذیب سے اصل موضوع بر آمد ہوتا ہے اور پھر پوری تاثیر و تعبیر کے ساتھ قلب و جگر اور فکر و نظر میں سما جاتا ہے۔"[۲]

اس مطالعہ میں سب سے پہلا نام قرۃ العین حیدر [20 جنوری 1926۔21 اگست 2007] کا ہے، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور اور جڑوں کی تلاش بالخصوص ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ کیے بغیر، اس کے یہاں کے موجود فکری بصیرت سے فیض یاب ہونا ممکن نہیں۔ قرۃ العین حیدر کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ وہ برِ صغیر کے مشترک کلچر، بھگتی تحریک، مغلوں اور سلاطینِ دہلی کے زمانے کی باطنیت سے بھی پہلے گپھاوں کے تپسویوں، اور بودھوں اور کوروؤں و پانڈوؤں اور آریوں کے تہذیبی تسلط اور شعوری ولا شعوری رشتوں کی بازیافت کے وسیلے سے زندگی کے المیے اور اس کے ازلی اور بنیادی سوالات کو اظہار کی زبان دیتی ہیں جدید طرزِ اظہار میں اپنے ناول لکھنے کا انتخاب کر کے قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے موضوع کو وسیع تر تناظر فراہم کیا جائے۔ قرۃ العین حیدر خود اپنی تخلیقات کو مابعد التاریخ سے تعبیر کرتی ہیں کہ انکی تاریخ میں دلچسپی کے باوجود ان کے ناول تاریخی ناولوں کی اس قبولِ عام صنف سے تعلق نہیں رکھتے نہ ان کے ناولوں کی کہانی تاریخی کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخی شعور یا عصری بصیرت کی جڑیں تلاش کرنی ہوں تو لا محالہ آپکی نظریں قرۃ العین حیدر کے عہد میں موجود جاگیرداری، تعلقہ داری، زمیندارانہ نظام کے اندر تلاش کرتی ہیں۔ قرۃ العین کے ہاں تاریخی شعور کی تلاش بیک وقت مشکل بھی ہے اور بامعنی بھی کہ ان کا عہد تیز رفتار سماجی، سیاسی، تہذیبی، علمی تبدیلیوں کی زد پر تھا۔ ان کے ماضی قریب و بعید کا عہد، مغلیہ سلطنت کا مکمل انحطاط، اودھ کی تہذیب، مسلم معاشرے کی زوال پذیری، انگریزوں کی ہندوستان پر مکمل عملداری، غدر، سر سید کی تحریک علی گڑھ، کانگریس کی فعالیت، دو بڑی عالمی جنگیں (خود ان کا اپنا زمانہ) ، تقسیم ہند، ہجرت و فسادات، سقوط مشرقی پاکستان اور پھر اکیسویں صدی کی تیز رفتار تبدیلیوں کی زد پر تھا۔ دوسری طرف ان کا مطالعہ اور وہ علمی ادبی خانگی ماحول تھا جس نے انہیں دنیا میں نئے سیاسی و معاشی نظریات (مارکسزم، سوشلزم، فسطایت، کمیونزم،) سے آگاہ کیا۔

خود قرۃ العین حیدر نہ صرف ان تمام تبدیلیوں اور تغیراتِ زمانہ کی متاثرہ تھیں بلکہ تماشائی بھی، اور صرف تماشائی نہیں بلکہ عہد کے تجربات کی امین بھی۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں انفرادیت اور تہذیبی تشخص کی شناخت بارے کافی تردد دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی خاندانی روایات اور شجرہ نسب سے قلبی وابستگی ان کے نیم سوانحی ناول کارِ

جہاں دراز کی تین جلدوں ان کے انٹرویوز خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔ان کے ہاں ایک خاص قسم کا تفاخر ملتا ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں جس طبقہ اشرافیہ کو پیش کرتی ہیں وہ خود بھی اسی طبقہ کی نمائندہ ہیں۔قرۃ العین کا تاریخی و تہذیبی شعور ان کے عہد اور خاندانی پرورش، تعلیم و تربیت، تعلیم یافتہ والدین کی روشن خیالی۔تہذیبی تعلیمی ادبی سیاسی، صحافتی سرگرمیوں اور زندگی کے عمیق مطالعہ سے پھوٹتا ہے۔جس کلاس سے وہ تعلق رکھتی ہیں اور جس خاندانی تہذیبی،ادبی ماحول اور روایات سے وہ وابستہ رہی ہیں اس میں ایک خاص طرح کا افتخار جنم لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔اس لیے جب بھی ان سے ان کی شخصیت کے متعلق سوال کیا گیا انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کو اپنی شخصیت کا جزوِلازم قرار دیا۔

ان کے ہاں نسلی افتخار نہ صرف انہیں اپنے خاندانی شجرہ کو بلکہ خود ان کے عہد کو تخلیقی سطح پر محفوظ کرنے کے لیے اکساتا ہے۔اور یہی افتخار قرۃ العین کو خاندانی روایات کے کھونچے اتارنے نہیں دیتا بلکہ نسلی افتخار،ذکاوت علمی،ادبی کاوشوں اور کافی حد تک طبقاتی امتیاز کو تہذیبی حوالوں سے مزید سنوارتی ہیں۔اسی لیے ان کے ناولوں میں متوسط طبقہ یا نچلا طبقہ کے مسائل بہت کم زیرِ بحث آئے ہیں۔جس میں ان کے عہد کے ناول نگار الجھے رہے۔اس طبقہ کے معاشی و سماجی مسائل قرۃ العین کا نہ تو مسائل تھے اور نہ ان کے تخلیقی تجربہ کی اساس بن سکے۔قرۃ العین کے مسائل زیادہ تر تہذیبی و فکری نوعیت کے رہے۔یوں تقسیم ہند قرۃ العین کے ہاں معاشی مسائل سے ہٹ کر تہذیبی تاریخی حوالوں سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ان کے ہاں کہانی یا قصہ سے زیادہ فکشن میں اہمیت اس بصیرت کی ہے جو تہذیبی اور تاریخی شعور کی حامل ہے۔وہ جس تہذیبی و تاریخی ورثہ کی امانت دار ہیں۔ایسے میں ماضی کی شاندار اور کربناک یادوں کا اسیر ہونا لازم تھا۔لیکن ان کا ناسٹلجیا اپنے قاری کو کسی بھی طرح کی مفعولیت میں مبتلا نہیں کرتا۔بلکہ وہ تہذیبی و تاریخی سطح پر ایسے سوالات اٹھاتی ہیں جن سے ذہنِ انسانی کی گرہیں کھل سکیں۔قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخی و تہذیبی شعور کی کارفرمائی کے مطالعہ کے لیے ان کے کسی ایک ناول سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔بلکہ ان کے تقریباً تمام ناولوں میں یہ عناصر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔قصہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کا فکر و فن ارتقاپذیر تو رہا ہے۔لیکن تاریخیت کا عنصر ان میں قدر مشترک رہا۔اس لیے ان کے تمام ناول ایک کڑی میں پروے ہوئے ہیں اگر قرۃ العین کے نظام فکر کو سمجھنا ہو تو ان سب ناولوں کے مطالعہ کے بغیر بات بنتی نہیں ہے۔اس کے علاوہ ان کے کچھ طویل مختصر افسانوں مثلاً سیتاہرن، چائے کے باغ، جلاوطن، ہاؤسنگ سوسائیٹی، سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات، اگلے جنم موہے بیٹیانہ کیجیو، اور دلربا اور کچھ مختصر افسانے جن میں ان کے مخصوص تاریخی شعور کی نمائندگی ہوتی ہے، سینٹ فلورا آف جارجیا کے

اعترافات، آئینہ فروشِ شہر کوراں، ملفوظات حاجی گل بابا، فوٹو گرافر، روشنی کی رفتار، لکڑ بگھے کی ہنسی، ڈالن والا، قلندر ، کار من، ایک مکالمہ، پت جھڑ کی آواز، آوارہ گرد، یاد کی ایک دھنک جلے، فقیروں کی پہاڑی، نظارہ در میاں ہے، اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے، دو سیاح اور یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے، قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے، کیکٹس لینڈ میں تاریخ کے گزشتہ ادوار، کی تہذیبی باز آفرینی کی گئی ہے۔ وقت کا تصور ان کے ہاں جبر کی علامت ہے وہ جبر جو مقدر اور تاریخ کا جبر ہے۔ وقت جو زندگی اور موت کے بیچ کی کڑی ہے۔ اور مقدر جو انسان کو اپنی تمام تر ترقی اور فضیلت کے باوجود وقت کے بے رحم ہاتھوں میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں اور ناولوں کے کردار تاریخی جبر کے ہاتھوں اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخی و تہذیبی سطح پر یہ بات اہم ہے کہ وہ سماج یا معاشرے کو جامد یا ٹھہری ہوئی شکل میں پیش نہیں کرتیں ان کے ہاں سماج یا معاشرہ پس منظر میں رہنے والا عنصر نہیں ہے بلکہ یہ ان کے ادب میں متحرک کردار ہے جو انسانی کرداروں کے اندر تبدیلیوں کا موجب بنتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی بھی عہد کے تاریخی پس منظر یا روحِ عصر کی ترجمانی کے لیے اخباری سطح پر اطلاع نہیں دیتیں نہ وہ سطحی واقعات ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ نہ جنگ و جدل، فسادات، ہجرت، مہاجرین یا شرنارتھیوں کی تعداد اور رقت آمیز تفصیلات بیان کرتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ سیاسی، مذہبی سماجی حالات، سماجی ڈھانچے، مختلف طبقات بالخصوص عورت کا سماج میں مقام و مرتبہ ذہنی رویے، ایسی دلچسپ اور مکمل صورت میں تجزیاتی انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قاری اس عہد کے تاریخی و سماجی تقاضوں سے آشنائی محسوس کرتا ہے۔

پھر قرۃ العین حیدر کا مطالعہ وسیع اور مزاج محققانہ ہے۔ کسی بھی موضوع پر قلم اُٹھانے سے پیشتر اس کی تمام جزئیات سے واقفیت حاصل کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ مثلاً گردشِ رنگ چمن میں غدر کو موضوع بنایا تو بقول انکے غدر کے متعلق پڑھا اور ان لوگوں کے قلم سے پڑھا جنہوں نے خود اس کا براہ راست مشاہدہ کیا۔ یا وہ اس تجربہ کے امانت دار تھے۔

قرۃ العین حیدر کی شخصیت میں موجود تاریخی بصیرت، مشاہدہ، قابلیت، فراست اور تخیل کی زبردست قوت ہے جو تاریخ کی گمشدہ کڑیوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے یا مستقبل کی پیش بینی۔ مثلاً آگ کا دریا 1956 کے آس پاس لکھا اور 1970 میں سقوط ڈھاکہ میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق اشارے موجود ہیں۔ اسی لیے وہ تاریخی تسلسل کی قائل تھیں۔ کہ ماضی حال میں موجود ہے اور مستقبل بھی دونوں زمانوں سے جڑا ہوا ہے۔

ان کے ناول میرے بھی صنم خانے میں ہندوستان کے تاریخی اتار چڑھاو، ذاتی المیہ، ذہنی جلاوطنی، تشخص اور جڑوں کی تلاش، خوابوں کا ٹوٹنا، مغائرت اور اوودھ کے تعلقہ داری نظام کی تہذیبی روایات سے قلبی وابستگی اور اقدار کے انہدام کا نوحہ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بصیرت کا اظہار بھی کرتی ہیں کہ جاگیر داری یا تعلقہ داری نظام سے انکی قلبی وابستگی انکی مجبوری صحیح لیکن اس بات سے کیا انکار ممکن ہے کہ اس طبقہ نے ہندوستانی معاشرے کے اندر نفاست اور تہذیب کی ان اقدار سے نوازا جو پیسے مال وزر سے لازمی طور پر وابستہ نہیں۔ ان کے ناول آگ کا دریا میں برِ صغیر کی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ، گوتم بدھ، انگریزوں کی آمد، تحریک پاکستان، اور ان سب واقعات سے وابستہ تاریخی جبریت، تصورِ زماں اور انسانی تہذیب کے عروج و زوال کی داستان تفاخر کے ساتھ ساتھ دو سرحدوں اور دو دنیاوں ،کھوئے ہوؤں کی جستجو، تہذیبی شناخت کی گمشدگی کو اس لیے بیان کرتی ہے کہ یہ براہ راست ان کے طبقے ان کے عہد سے وابستہ تھا۔ قرۃ العین حیدر مشترکہ ہند مسلم کلچر کی سب سے بڑی حامی تھیں ،ان کا ناول آخرِ شب کے ہمسفر بنگالیوں کے تہذیبی وتاریخی مطالعہ پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ ناول میں بنگالی قوم پرستانہ جذبوں کی جڑیں، انقلاب کی رومان انگیزی اور سامراجی میراث، طبقاتی تقسیم میں پستا نچلا اور متوسط طبقہ، پاکستان کا دولخت ہونا جیسے اہم تاریخی مباحث کی پیشکش پر مبنی ہے۔ گردشِ رنگ چمن برطانوی ہند میں نئے طبقات کی ظہور پذیری، اس عہد کا لونیل ہندوستان، لوگوں کی اس نظام سے مفاہمت، اوودھ کی تہذیبی فضا میں عورت اور طوائف کا طبقہ کس طور پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک وقت میں ایلیٹ کہلانے والے مغل کس حال میں زندگی بسر کرتے ہیں، نئے یوریشین طبقات کی حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداریاں اور اپنے ہی نیٹوز رشتہ داروں کے درمیان بڑھتی دوریاں تاریخی و تہذیبی تناظر میں اختلاف کی وجوہات کا بہت مؤثر احوال ناول کا حصہ ہے۔ چاندنی بیگم کالونیل ہند کے بعد کی مسلم معاشرے کی تاریخ و تہذیب، مسلم معاشرت کے زوال اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی تک کا منطقی انجام، نئے طبقات کی ظہور پذیری، سرمایہ دارانہ معاشرہ، تہذیب کی پرانی اقدار کا تیزی سے خاتمے کا نوحہ۔ ماضی کی کشش، حال کا بکھراؤ، طبقہ اشرافیہ کا زوال، ماضی کی کربناک یادیں اور ہندوستانی پاکستانی قومیت میں بٹے ایک ہی خاندان کے درمیان تیزی سے جنم لیتی دوریوں جیسے رویوں کا تجزیاتی مطالعہ ملتا ہے۔

اسی عہد کا ایک اور ناول نگار جس نے اپنے ناولوں میں تاریخی شعور کو ایک بالکل متنوع جہت میں پیش کیا وہ شوکت صدیقی [20 مارچ 1923-18 دسمبر 2006] تھے لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شوکت صدیقی کے تاریخی و تہذیبی شعور کا ناول کے اندر جو اظہار ملتا ہے اس کا جائزہ لینے سے قبل یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ان کا سماجی و تہذیبی فلسفہ تاریخی و سیاسی تناظر میں کیا رہا ہے۔؟ اس کے پیچھے کونسے محرکات تھے جس نے انہیں ایک مخصوص فلسفہ حیات

کی تشکیل، مطالعہ، اور عملی وابستگی کے لیے تیار کیا۔؟اس سلسلے میں ان کے عہد کے سیاسی تناظرات ہیں۔ بر صغیر میں پہلی عالمی جنگ کے بعد کی صورتحال ہے۔ جب عالمی سطح پر برپا شورش اور ہنگامے سلطنتِ برطانیہ کی اس بہت بڑی نو آبادیات پر براہ راست اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ اس وقت یہ برطانوی نو آبادیات کے لیے خام مال کی فراہمی اور تیار مصنوعات کی کھپت کی سب سے بڑی منڈی ثابت ہو رہا تھا جس سے اس وقت کا ہندوستانی معاشرہ طبقاتی سطح پر دو بڑے خانوں میں بٹ چکا تھا۔ امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہو رہے تھے ہندوستان میں یہ استحصالی صورتحال اس کی معیشت کو اور دگرگوں کر رہی تھی۔ زمیندار، جاگیر دار، تعلقہ دار زرعی معیشت پر قابض تھے۔ صنعتوں کا کہیں وجود نہیں تھا بھوک اور تنگدستی اس وقت کی عام رعایا کا مقدر بن چکی تھیں۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ انگریزوں کی لائی ہوئی تمام تر قباحتیں، سامراجی مفادات کی پالیسیاں اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود ایک طاقتور کلچر کے لائے ہوئے نئے تصواتِ جدید علوم، تہذیبی مظاہر ادبی اسالیب ایک نئے شعور طرزِ زندگی کے نئے طور سے اذہان کو ضرور متاثر کر رہے تھے۔ ادبی سطح پر اس وقت انگریزی کی تعلیم اور ادبی تراجم کا آغاز، سرسید تحریک، فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج جیسے اداروں سے ہو رہا تھا اور انہوں نے بھی ایک بالکل نئی فضا سازی کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا، ایسے میں ادبی سطح پر پریم چند سماج میں ناانصافی، تضادات کی مختلف شکلوں کے مشاہدہ بیں ہوئے اور 1901 کے لگ بھگ بڑی دردمندی اور خلوص کے ساتھ سماجی حقیقت نگاری کی طرف بڑھتے ہیں۔ جبکہ ابھی ادب کا واسطہ سماج سے براہ راست نہیں جڑا تھا۔ دوسری طرف فسانہ آزاد اودھ پنچ کے تحت داستانوی ماحول کے ساتھ معروض کی کچھ جھلکیاں بھی پیش کر رہا تھا۔ جس میں خوجی کا کردار اپنی بناوٹ کے اعتبار سے مغرب سے درآمد شدہ کردار محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف بنگال سے آنے والے مختلف رجحانات اور رویے تھے۔ بالخصوص سوامی گوپی نند، سرت چندر چیٹر جی، رابندر ناتھ ٹیگور، جنہوں نے روسی انقلاب کے بعد سوشلزم کو ہندوستانی مسائل کا حل سمجھا۔ اسی کے زیرِ اثر یہاں رومان پسندوں نے ادب اور سماج دونوں میں بغاوت کی ایک اور شکل کو رائج کیا اور فرسودہ رواجوں، ریتی رسموں، مذہبی اور سماجی جبر کے خلاف ردِ عمل ظاہر کیا بالخصوص سماج میں عورت کا کردار، خاص کر طوائف کو جس تہذیبی ناسور کے طور پر شناخت کیا جاتا تھا اس کو بطورِ خاص موضوع بنایا۔ اوہام پرستی اور جاگیر دارانہ تہذیب کے کھوکھلے معیارات کو بے نقاب کیا گیا۔ روشن خیالی کی فضا ہموار کی گئی۔ ایک طرف سیاسی سطح پر محاذ گرم تھا تو دوسری طرف ادبی سطح پر انگارے، شعلے اور پھر انجمن ترقی پسند مصنفین اور پریم چند نے سماجی اور طبقاتی ناانصافی کو موضوع بنایا۔ جھوٹی تہذیبی اقدار، معاشرتی گراوٹ، انگریزوں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کو کھلم کھلا چیلنج کیا گیا۔ یہ تو وہ معروضی ادبی منظر نامہ تھا جس سے شوکت صدیقی کا واسطہ پڑا۔ تو دوسری طرف شوکت صدیقی کی زندگی اور فن پر دو تجربات کی چھاپ موجود ہے

اوّل انکی صحافتی زندگی ہے جس میں ادبی رسائل ماہنامہ 'ترکش، مندر، اور جدید ادب، کے مدیر رہے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ 'پاکستان اسٹینڈرڈ'، روزنامہ ٹائمز آف کراچی، 'مارننگ نیوز'، انجام، الفتح اور مساوات کے ایڈیٹر رہے'[۳]

دوسری جنگِ عظیم میں فوج میں ملازم رہے 1949 میں لکھنو یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا ۔1950 میں پاکستان [لاہور] آئے اور پھر کراچی منتقل ہوگئے، 1952 میں ڈاکٹر محمد سعید خان کی صاحبزادی 'ثریا بیگم، سے شادی کی۔ دوم ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ تحریک کے بانیوں ڈاکٹر عبدالعلیم، نیاز فتح پوری، پروفیسر احتشام حسین، نواب جعفر علی خان اثر اور پنڈت کشن پرشاد کول جیسے معروف ادیبوں کے ساتھ نشست و برخاست رہی۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستگی کے باعث گرفتار ہوئے دو ماہ تک جیل میں رہے۔۔ پاکستان رائٹر گلڈز کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ 1985 انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں کنوینگ کمیٹی کے چیئر مین اور مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ 1987 میں ماسکو عالمی امن کانفرنس میں شرکت کی۔ کبھی ادبی وفود کی نمائندگی کی، کبھی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ غیر ملکی دوروں میں اور کبھی ذاتی طور پر دنیا کے اکثر ممالک کا دورہ کیا۔ 1997ء میں حکومتِ پاکستان نے ادب میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ ''تمغہ حسنِ کارکردگی'' عطا کیا شوکت صدیقی نے 1950 سے 2000 تک کے پانچ عشروں میں ادبی اور صحافیانہ اعتبار سے بہت متحرک زندگی گزاری۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے قریب رہے۔ ان کے ساتھ بیرونِ ملک دوروں میں شریک رہے۔ پیپلز پارٹی کی قومیانے کی پالیسی اور نجی ملکیت کے خاتمے کے لیے کی گئی سماجی اور اقتصادی اصلاحات [بڑی اور کلیدی صنعتوں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور ایسے ہی دوسرے اداروں کی نجی ملکیت ختم کر کے قومی تحویل میں لینا، تعلیمی پالیسی کے تحت نجی درسگاہوں اور تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینا، آبیانہ معاف کرنا، ادویات کے برانڈ نام ختم کر کے جنرک اسکیم کا نفاذ، بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ، ایسے اقدامات] کو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شوکت صدیقی کی شخصیت کی تشکیل میں کثیر افرادِ خانہ [ان کے والد الطاف حسین سترہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور خود شوکت صدیقی سات بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھے] کمزور مالی حالات نے اہم کردار ادا کیا۔ شوکت صدیقی کا تجربہ اور مشاہدہ ان کے نظریہ حیات یا فلسفہ حیات کے حوالے سے خاصا گہرا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں سماجی و تاریخی شعور، طبقاتی تفاوت کی بات کرتے رہے۔ تو یہ وہ فلسفہ حیات نہیں ہے جسے آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یا بطور فیشن کسی عہد کے رجحانات دیکھتے ہوئے یا خود کو پیش قدم یا ترقی پسندوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں ڈاکٹر ستیہ پال آنند ''شوکت صدیقی۔ ایک سوانحی مونتاژ'' میں رقمطراز ہیں:

" 1928ءتا1938....دس یا گیارہ برس ایک حساس لڑکے کو زندگی کا تلخ سبق سکھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔فاقے کی نوبت تو شاید نہ آتی ہو لیکن اگر شوکت صدیقی کی کچھ کہانیوں میں سوانحی عنصر تلاش کیا جائے تو صرف دو کُرتے اور دو پاجامے ہونے اور صرف ایک جوڑا ربڑ کے سلیپر نما بوٹ ہونے کا سراغ ملتا ہے بھائی کے گھر میں اپنے اور بھائی کے بچوں کے کپڑے دھونے اور گھر کے کام کاج میں بڑی بھابھی کا ہاتھ بٹانے کی کچھ سو بو ملتی ہے جیب خرچ کے بالکل نہ ہونے اور آدھی چھٹی کے وقت جب دیگر لڑکے خوانچہ فروشوں کے گرد جمگھٹ لگا کر چٹ پٹی چیزیں خرید رہے ہوتے تھے تو ان سے دور کھڑے ہو کر گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر گم صم رہنے کی خبر ملتی ہے۔"[۴]

وہ خود اس عسرت اور معاشی بدحالی سے گزرے بھی ہیں اور اس بالکل نچلے طبقے کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع بھی ملا ہے۔کیونکہ تقسیم کے بعد انہیں ایک ایسا ماحول میسر آیا کہ انہوں نے نہ صرف تقسیم کے عمل کو سمجھا بلکہ زمینی حقائق کے ساتھ اس کی معنویت بھی ان پر آشکار ہوئی۔انہوں نے نچلے طبقے کی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ان کے مسائل کو سمجھا،اعلیٰ طبقات کے ساتھ وابستہ دوہرے معیارات اور منافقانہ طرزِ عمل پر بھی انکی نظر پڑی۔۱۹۵۹ کے لگ بھگ جب وہ پاکستان آتے ہیں تو معاشی تنگدستی کا ساتھ ان کے ہمرکاب ہے،اور یہ بعینہ وہی زمانہ ہے جب ان کے خیالات میں تبدیلی آئی اور خدا کی بستی کے کرداروں کو انہوں نے اپنے ساتھ،ارد گرد چلتے پھرتے،اور بولتے، جملے کستے سنا ہو گا۔ان کے افسانوی مجموعہ تیسرا آدمی میں یہ تبدیلی انکی گذشتہ تخلیقات کے بالمقابل دیکھی جا سکتی ہے۔اس وقت انہیں ایک افسانہ لکھنے کے پچاس روپے بطور معاوضہ ملتا تھا۔ہر ہفتہ ایک افسانہ لکھنا ان کے معمولات میں تھا۔جیب کتروں،اٹھائی گیروں اور جواریوں کے ساتھ انہیں وقت گزارنے کا موقع ملا۔ایک ایسے باشعور، تعلیم یافتہ اور تخلیقی ذہن کے لیے یہ مشاہدہ اور تجربہ کس قدر بامعنی سطح پر ہوا ہو گا اس کا اظہار ان کے افسانوی مجموعے "تیسرا آدمی"، "راتوں کا شہر" اور ناول خدا کی بستی میں دیکھا جا سکتا ہے۔انکے بقول "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جیکب لائن کے ایک تنگ کوارٹر میں رات گئے میں بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے بدقماش لوگ جواء کھیل رہے تھے جوئے کی ایک کھدری قسم ہوتی ہے جسے "مانگ پتہ" کہتے ہیں وہ مانگ پتہ کھیل رہے تھے اور چرس پی رہے تھے۔کمرہ دھویں سے بھرا ہوا تھا اور میں چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے کہانی لکھنے میں مگن تھا۔وہ کھیلتے کھیلتے مجھے مخاطب کر کے کہتے "سوکت صاب!معسوکوں کو خط لکھے جا رہے ہیں" خدا کی بستی کی کہانی اسی زمانے کی ہے تاہم میں اصرار کے ساتھ

کے برعکس جانگلوس اور اور کسی حد تک چار دیواری کے کرداروں کا وجود حقیقی ہے اور اس میں بیشتر واقعات بڑی حد تک حقائق پر مبنی ہیں''[۵]

کراچی آمد سے قبل انکی کہانیوں میں فکری حوالے سے سماجی اور اقتصادی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ جیسا کہ انکے پہلے دو مجموعوں ''تیسرا آدمی'' اور ''اندھیرا اور اندھیرا'' میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن بعد میں کراچی آمد اور معاشی مسائل کے ساتھ نئے ماحول میں سر گرم عناصر ،سماج کے اندر ہونے والے نئے بدلاؤ نچلے طبقات کے رجحانات، مسائل اور تضادات نے انکے یہاں سماجی، اقتصادی مسائل کے ساتھ جرائم پیشہ کرداروں کی سائیکی، ان کے پسِ پردہ محرکات اور رویوں کا مشاہدہ اور مطالعہ ملتا ہے۔ وہ خود اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نقاد اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں مگر ان کا مفہوم ان کے ذہن میں واضح نہیں ہوتا ۔اب اسی اصطلاح کو لیجیے۔ جسے کرمنالوجی یعنی جرمیات کہا جاتا ہے۔ان کے ذہن میں صرف یہی تصور ہوتا ہے۔ کہ جرائم صرف چوری ڈکیتی، اغوا اور لوٹ مار وغیرہ ہیں جو عام طور پر دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ مگر کیا یہی جرائم جاگیر دار اور سرمایہ دار اور دوسرے حکمران طبقات نہیں انجام دیتے اور اگر ہاں آپ گہرائی میں جائیں اور ان کا تجزیہ کریں تو یہ واضح ہو گا کہ انکی بنیاد محنت کا استحصال ہی ہوتی ہے اور انکی نوعیت طبقاتی ہوتی ہے استحصال زدہ طبقات کے خلاف قانون کی خلاف ورزی کو جرم سمجھ لیا جاتا ہے اور حکمران طبقات اور مملکت کی مشینری کے لیے ایسے ہی ناروا اقدامات کو جرم نہیں قرار دیا جاتا۔ یہ ایک معاشرتی المیہ ہے جس کی بنیاد طبقاتی عدم مساوات پر ہے''[۶]

مطالعہ ان کا بہت وسیع تھا، خاص کر مغربی ادب کا مطالعہ کیا۔ پسندیدہ ادیبوں میں پریم چند، چارلس ڈکنز ،ٹالسٹائی، میکسم گورکی، بالزاک، دستوفسکی منٹو اور بیدی تھے۔ اشتراکیت کا فلسفہ ان کا مسلکِ حیات تھا جس کا انتخاب خوب سوچ بچار کے بعد کیا۔ تاریخ اور اشتراکی فلسفے کا مطالعہ انہوں نے دلجمعی سے کیا۔ اس مطالعے کو اپنے مشاہدے سے تقویت دی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بقول کارل مارکس ،جملہ معلوم تاریخ ،طبقاتی تقسیم اور کشمکش کی تاریخ ہے۔ شوکت صدیقی کا تاریخی و تہذیبی شعور قومی بیانیہ سے ہٹ کر تاریخ کو نصابی ضروریات سے مبرّا کر کے پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انکی کتاب ''گمشدہ اوراق' برِ صغیر کی تاریخ کی ان جہات کا احاطہ کرتی ہے جس کے تحت برطانوی استعمار کی سازشوں اور دوہری پالیسوں کے ردِ عمل میں یہاں کے باسیوں نے بھی ایکشن لیا شوکت صدیقی کی سیاسی عمرانی اور سماجی فکر و فلسفہ کو تین فکری ستون پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر بالخصوص مسلمان اور پاکستان کے مسلمانوں کے

اندر سوشلزم کے بارے مخصوص نظریات کی ترویج کا تاریخی و سیاسی تناظر میں جائزہ۔نوآبادکاروں کی سامراجی پالیسیاں اور انکے سہولت کاروں کے مفادات۔ ''گمشدہ اوراق''شوکت صدیقی کی تاریخ سے دلچسپی اور تنقیدی و تاریخی شعور کا احاطہ کرتی ہے۔ڈاکٹر جعفر احمد شوکت صدیقی کے تاریخی شعور کے حوالے سے بجا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''شوکت صدیقی صاحب کی ایک اور قابل ذکر کتاب ''گمشدہ اوراق'' کے نام سے شائع ہوئی جس میں ان کے وہ مضامین یکجا کیے گئے ہیں جو برِ صغیر میں برطانوی استعمار کی ریشہ دوانیوں اور اس کے ردِ عمل میں اٹھنے والی احتجاجی اور انقلابی تحریکوں کا احاطہ کرتے ہیں اس کتاب میں تحریک ہجرت ،غدر تحریک ،غدر پارٹی ،ریشمی رومال تحریک، کمیونسٹ پارٹی اور ایسے ہی دیگر موضوعات پر فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کی اہمیت اُس وقت ہمارے سامنے زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے جب ہم اپنے یہاں پچھلے ساٹھ پینسٹھ برسوں میں سرکاری سطح پر لکھی یا لکھوائی گئی تاریخ کی کتابوں کے تناظر میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔بد قسمتی سے ہمارے یہاں جس قسم کی تاریخ نویسی کو فروغ دیا گیا ہے اس میں برصغیر کی انقلابی تحریکوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ہماری روایتی تاریک نویسی تحریکِ آزادی کے نام پر جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے وہ تمام و کمال برِ صغیر کے فرقہ وارانہ(communal) قصے تک محدود ہے کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش اور انکی سیاسی آویزش، متحدہ قومیت اور مسلم قومیت کے مباحثے نیز متحدہ ہندوستان یا ایک منقسم ہندوستان کی بحثیں یہ امور ہی ہماری تاریخ کا کل مافیہ فراہم کرتے ہیں''[۷]

شوکت صدیقی کا مطالعہ انہیں باور کراتا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی جتنی بھی سیاسی تحریکیں ابھریں وہ بنیادی طور پر سامراج دشمن تھیں۔ سید احمد شہید بریلوی کی جماعت مجاہدین ۔ جنگ آزادی1857،دیو بند تحریک، تحریک ہجرت، تحریکِ خلافت اور تحریک پاکستان تمام تحریکیں اپنے مزاج کے اعتبار سے سامراج مخالف تھیں۔ حتیٰ کہ جب 1917 کا انقلاب روس اپنے جلو میں جس فلسفہ حیات کو اپنے ساتھ لایا اس کا بھی خیر مقدم مسلمانوں اور بالخصوص حکیم الامت علامہ اقبال نے کیا۔ جبکہ اس سے قبل جماعتِ اسلامی اور اس جیسی دیگر مذہبی اور نیم مذہبی جماعتیں مغربی طاقتوں کے طرز معاشرت اور سیاست کی سخت مخالف تھیں۔اسی کتاب میں انہوں نے اظہار کیا ہے کہ کس طرح مغربی طاقتیں ذرائع ابلاغ کی قوت سے رائے عامہ ہموار کرتی ہیں، بالخصوص ایک ایسا معاشرہ جو تقلیدی روش رکھتا ہے اور جس کا مزج غیر تحقیقی ہو وہاں کس قدر موثر انداز میں معاشرے کی فکری جہات کو اگلے کئی

عشروں تک اپنے مقاصد کے لیے ایک مخصوص نہج دی جاسکتی ہے۔اس کی طرف بھی شوکت صدیقی اپنی کتاب میں اشارہ کرتے ہیں کہ ان نو آبادکاروں نے برِ صغیر کے عوام کی ذہنی فضا سازی کے لیے کس طرح سامراج دشمن تحریکوں کا رخ سوشلزم کی طرف موڑ دیا۔

''شوکت صدیقی صاحب کا فکشن اس لحاظ سے بہت قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے۔کہ وہ بدلتے ہوئے پاکستانی سماج کو دیکھنے اور اس کا اعتراف کرنے میں ناکام نہیں رہے۔ایک لحاظ سے یہ اُن کی بہت بڑی کامیابی بھی ہے کیونکہ وہ ایک یکسر مختلف پس منظر اور ماحول سے نکل کر پاکستان پہنچے تھے لیکن شوکت صدیقی نے پاکستان آنے کے بعد یہاں کے تہذیبی خدوخال اور ثقافتی تنوعات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائی اور پھر انہوں نے پاکستان میں بدلتے ہوئے سماج کی حرکیات کو بہت احسن طور پر سمجھنا شروع کر دیا تھا اُن کے ناولوں اور افسانوں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور اُن کے کردار جن لفظیات کا سہارا لیتے ہیں اُس کا ذرا سا بھی اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے تھے جو تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان میں آباد تھے اور پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں سے کبھی ان کو سابقہ نہیں رہا تھا۔یہی نہیں بلکہ انہوں مقامی لب ولہجہ اور مقامی زبانوں کو برتنے کی بھی کامیاب کوشش کی''[۸]

شوکت صدیقی کا یہ ناول ''خدا کی بستی'' سماج اور معاشرے کے انہی رنگوں کے متعلق ہے۔یا یوں کہیے اس ناسور کے متعلق ہے جس نے ابتداء میں ہی پاکستان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کر دی تھیں۔تقسیم اور فسادات کا المیہ اس سماج کے اندر کسی بھی قسم کی نظریاتی، داخلی قوت کے طور پر نہیں سامنے آسکا بنیادی طور پر یہ ایک ناکام تجربہ تھا کیونکہ یہاں کے باسیوں نے آزادی، ہجرت، تقسیم کے بعد فسادات ایسے المیوں سے کسی مفروضہ یا خوش کن معاشرے کی تشکیل کے امکانات کو دریافت کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی، نہ ریاستی سطح پر، نہ معاشرتی سطح پر نہ فرد کی سطح پر۔بلکہ یہ تجربہ ایک ایسے تہذیبی المیے اور مسائل ساتھ لایا جہاں تہذیبی، اخلاقی، سماجی اقدار مادیت پرستی ،اور چھینا جھپٹی کے عمل کے سامنے بھربھری ریت بن گئی۔کس طرح معاشرے کے اندر امیر امیر تر ہوتے گئے اور غریب غریب تر۔کیونکر چوری، ڈکیتی، فراڈ کرپشن جیسے عناصر نے سر اُٹھایا اور نئی نسل کو استعمال کیا اس راستے پر ڈالا کہ جو کل چاقو استعمال کرتا تھا وہ آج کلاشنکوف استعمال کرتا ہے۔

''کمیں گاہ'' ساٹھ کی دہائی میں پہلی بار منظرِ عام پر آیا۔تقریباً 176 صفحات پر مشتمل ایک مختصر ناول ہے۔شوکت صدیقی کا یہ ناول سرمایہ دارانہ اخلاقیات کی نقاب کشائی کرتا نظر آتا ہے۔'خدا کی بستی [1958] کے

تیس سال بعد جانگلوس، تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ناول 1988ء میں شائع ہوا۔ کتابی شکل [تین جلدوں] میں اس کی اشاعت سے قبل یہ 'سب رنگ ڈائجسٹ' میں سلسلہ وار شائع ہونے والا مقبول ترین ناول تھا۔

جانگلوس انہوں نے 1978ء میں لکھنا شروع کیا جس کے پیچھے محرک ان کا وہ مضمون بن گیا ''چھوٹے چور بڑے چور'' جو 17 مئی 1976 میں لکھا گیا۔ مساوات کے مدیر اور ایک طویل عرصہ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہنے کے سبب ان کا معاشرتی و تہذیبی انہدام کا بڑا گہرا مطالعہ تھا۔ سماجی شکست و ریخت کو وہ مارکسی تناظر میں دیکھتے تھے۔ چیزوں کو دیکھنے کا یہ سیاق انہیں بالآخر اس تھیسس تک لے گیا کہ معاشرتی استحصال اول اول محنت کی چوری سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا اظہار انہوں جس کا اظہار انہوں نے وقتاً فوقتاً کئی مقامات پر کیا۔ انکے نزدیک معاشرتی سماجی معاملات میں وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں جو آغازِ کار ایک فرد یا ایک خاندان کی محنت کی چوری تک محدود ہوتی ہیں رفتہ رفتہ وہ بڑھ کر استحصال کی شکل میں سماج کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے طبقاتی حد بندیوں اور استحصال کا آغاز احساسِ ملکیت سے شروع ہوا جب کسی نے زمین کے ایک ٹکڑے پر قبضہ کر کے کہا کہ ''یہ میری ملکیت ہے'' یا جب جنگوں کے دوران ہاتھ لگنے والے انسانوں کو غلام بنانے کا عمل شروع ہوا جو کہ انفرادی غلامی پر مشتمل تھا یا مویشیوں کے لیے بھی ذاتی ملکیت کا دعویٰ کیا گیا۔ لہذا شوکت صدیقی کا تاریخی شعور انہیں آج تک کے انسانی معاشرے کو تین ادوار یا مراحل غلام داری، جاگیر داری اور سرمایہ داری سے گزرتا ہوا دکھاتا ہے شوکت صدیقی کی اشتراکیت پسند اپروچ اسے ماضی کا قیدی نہیں بناتی بلکہ زندگی سے متعلق پریکٹیکل اپروچ کا مطالعہ ملتا ہے ان کے ناولوں میں تقسیم کے بعد کا منظر نامہ، کراچی میں نیا ابھرتا پاکستانی معاشرہ جو جھگیوں اور جھونپڑ پٹی جیسی بستیوں سے ابھرتا ہے، پاکستانی سیاسی سماجی صورتحال بے ساختہ اظہار، تہذیبی و ثقافتی قدروں کا بحران، صنعتی عہد، سماجی مرتبہ کی خواہش، دولت کے حصول کی اندھی لگن، مستقبل کا خوف، زندگی کا بدہیت نقش، بیوروکریسی، نودولتیا طبقہ، آدرشوں کا ٹوٹنا، جرائم کی دنیا، دیہی پنجاب کی تصویر کشی، جعلی کلیموں کا بازار گرم کرتے مقامی جاگیر دار، غربت کی انتہا، عورت کی مظلومیت، چادر اور چار دیواری کے تناظر، لکھنو کا زوال پذیری تہذیبی معاشرہ، ہندوستان میں نیا ابھرتا ہوا سرمایہ دار اور انڈسٹریل طبقہ اور اس کی سفاکانہ اقدار ان کے ناولوں کا منظر نامہ ہے ۔

انتظار حسین [21 دسمبر 1925۔2 فروری 2016] پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ انکے والد منظر علی مذہبی ذہن کے آدمی تھے بقول انتظار حسین 'وہ کچھ واعظ اور مبلغ قسم کے آدمی تھے''[۹]

ان کی والدہ گھریلو خاتون تھیں جن سے انتظار صاحب کو بہت محبت تھی اور انکے مزاج میں موجود نفاست بھی انکی اپنی والدہ سے لگاؤ کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ ان کے والد انتظار حسین کو دینی تعلیم کی طرف لانا چاہتے تھے۔ لہذا عربی

انہوں نے اپنے والد سے پڑھی۔ اور ابتدائی تعلیم کا بندوبست بھی گھر پر تھا، کیونکہ انکے والد جدید تعلیم سے اس دور کے رائج رویوں میں سے ایک یعنی انگریزی کلچر، تہذیب اور تعلیم سے حتی الامکان دوری بنائے رکھنے کے رجحان کے حامل تھے۔ لہذا مڈل تک انکی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس دور میں املی، نیم، جامن، آم کے پیڑ انکے شعور کے ساتھی بنے اور اکّوں کی سواری انکا محبوب مشغلہ۔ اپنے اس دور کے متعلق وہ کہتے ہیں ''میں جب تک اس بستی میں رہا اسکول میں داخل نہیں ہوا۔ اس میں میرے والد صاحب کا ایک تعصب بھی کام کر رہا تھا ان کا تعصب یہ تھا کہ صاحب یہ جو نئی تعلیم ہے یہ کچھ بہت غلط ہے۔ تو وہ مصر تھے کہ میں تو اپنے بیٹے کو گھر پڑھاؤں گا اور عربی سے انہوں نے میری تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ تو وہ بہت سے سال مجھے عربی پڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور میں چھپ کر ان سے اردو کی کتابیں پڑھتا رہا۔ تو میرا مطالعہ اور یہ تعلیم جو ہے کہ میرے والد صاحب مجھے کچھ تعلیم دینے کی کوشش کر رہے تھے میں کچھ اور تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یعنی میں جنگلوں میں جا کر آم بیر اور اس قسم کی چیزیں توڑتا تھا۔ املی کی کٹاریں اور جو میں یعنی درختوں سے اور کھیتوں سے اور ان میدانوں سے جو میرا ربط ضبط قائم ہوتا تھا اس سے جو رعایتیں اور کہانیاں تھیں وہ انہیں قبول کر رہا تھا۔ انتظار حسین کے شعور کو مرتب کرنے میں الف لیلیٰ کی کہانیاں، والد ماجد کی مذہبی کتب، قصص الانبیاء، اور روز رات کو نانی اماں سے سنی ہوئی کہانیوں نے، مظاہر فطرت کے حوالے سے وساوس، توہمات کی وہ دنیا جو ہندوستانی تہذیب کی فضا میں ایک درخت یا کسی خالی پڑے گھر کے گرد آسیب اور جنوں کی وابستگی اور شگون لینے کے عمل سے جڑی ہے یہ سب چیزیں انتظار حسین کے شعور کا حصہ بن رہی تھیں۔ اور پھر اسی دور میں ان کا پہلا واسطہ کہانی کی ایک اور شکل سے پڑا جو راشد الخیری کی کہانیاں تھیں۔ والد کی مذہبی روایت کے اسیر انتظار حسین بعد میں اس سے بغاوت پر بھی بہت کچھ تیار ہو گئے جب انکی بڑی بہن حسنین فاطمہ کی خواہش پر انہیں اسکول میں داخل کرایا گیا۔ 1946 میں میرٹھ کالج میں ایم اے اردو کیا اساتذہ میں سے پروفیسر کرّار حسین سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ جبکہ حسن عسکری کی دعوت پر ہی انہوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ حسن عسکری کو بھی انکے معنوی اساتذہ میں شمار کیا جا سکتا ہے ''اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی و تشکیلی ادوار میں انہوں نے حسن عسکری سے گہرا اثر قبول کیا۔ ان کے ابتدائی مضامین میں یہ اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے اختلاف، فسادات کے افسانوں کے بارے میں نقطہ نظر اور پاکستانی ادب جیسے معاملات میں وہ محمد حسن عسکری کی اختیار کردہ راہ کے مسافر نظر آتے ہیں اور انکے خیالات سے دور نہیں جاتے۔ لاہور میں اپنے ابتدائی دنوں میں بھی وہ حسن عسکری کے زیر سایہ چلتے نظر آتے ہیں جس کا احوال انہوں نے 'چراغوں کا دھواں' میں بھی درج کیا ہے۔ انکے توسط سے وہ ناصر کاظمی سے بھی ملے جو انکے گہرے دوست بن گئے اور یہ دوستی انکی عسکری صاحب سے ارادت مندی میں دراڑ کا سبب بن گئی'' [۱۰]

دوسری طرف عسکری صاحب تصوف کی طرف چلے گئے اور انتظار حسین اپنی افتادِ طبع کے باعث ان راہوں سے دور رہے۔ اگرچہ یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ تصوف اور دینی و مذہبی رجحانات انکے خاندانی ورثہ یا روایت کا حصہ ہیں۔ 2011ء میں اپنی آپ بیتی 'جستجو کیا ہے' میں انہوں نے درج کیا ہے۔ کہ انکے خاندان کے ایک بزرگ خاندانی شجرے کو حضرت امام حسین سے جاملاتے تھے اور اس خاندان کو اہلِ سادات میں سے بتاتے تھے جبکہ عمر میمن کو دیے طویل انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

''میں بچپن میں سنتا رہوں کہ ہمارے خاندان میں ہر نسل میں کوئی نہ کوئی فقیر یا درویش یا صوفی جو بھی آپ کہنا چاہیں، ہوتا رہا ہے میرے ایک بزرگ تھے میرے والد صاحب کے ماموں جو بڑے عالم قسم کے آدمی تھے اور پورے علاقے میں ایک صوفی اور بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے[۱۱]

دوسری طرف انکی ماموں زاد بہن کے گھر میں رسالہ عصمت کا آنا اس بات کی علامت تھا کہ ایک طرف puritan رویہ ہے تو دوسری طرف انکے خاندان میں ادب اور جدید عہد کے ساتھ جڑت بھی موجود ہے۔

انتظار حسین کا عہد وہ ہے جو اپنے اندر مظہریاتی سطح پر بہت شعوری و غیر شعوری تبدیلیوں، تضادات کا حامل تھا۔ 1857 کا زمانہ ماضی قریب میں اس عہد کے مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور میں کرب انگیز عہد تھا تو اس کے ساتھ نو آبادیاتی ہندوستان ایک نئے کلچر کا ہر سطح پر سامنا بھی کر رہا تھا اور مسلمانوں کی طرف سے اسکے مقابل پسپائی کے آثار نمایاں تھے، یہ پسپائی اس وقت پہلی بار جدید عہد کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے جب سر سید احمد خان کی طرف سے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا گیا۔ 1925ء سے 2016ء تک تقریباً ایک صدی کے دوران کتنے بڑے تاریخی نوعیت کے واقعات کا مشاہدہ انتظار حسین نے کیا نہ صرف یہ بلکہ ان سب واقعات کو سیاسی و تہذیبی، تاریخی تناظرات میں ایک کلیت کے ساتھ دیکھا اور انسانی شعور میں اس کی عصری معنویت کا تعین کرنے کی کوشش بھی کی۔ 1857 کے غدر سے پہلی عالمی جنگ، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، تقسیمِ ہند، ہجرت، فسادات، نئے ملک کے تاریخی، تہذیبی، سیاسی فکری تناظرات کے وہ نہ صرف مشاہدہ بیں بھی تھے بلکہ تخلیقی اعتبار سے فعال بھی کہ آخری وقت تک ان کے کالم اخبارات میں چھپتے رہے۔ انتظار حسین کئی حوالوں سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں اور اپنی جگہ پر یہ حوالے بڑے پر اثر بھی ہیں ان کا مقدم تخلیقی حوالہ تو افسانہ کا ہے۔ پہلا افسانہ 1947 میں قیوما کی دکان لکھا۔ کل نو افسانوی مجموعے لکھے، انکے ناول اور مختصر ناولوں کی کل تعداد پانچ ہے۔ انتظار حسین کے چار ناولوں چاند گرہن، بستی، نیا گھر اور آگے سمندر ہے کے تاریخی و تہذیبی مطالعہ کو موضوع بناتا ہے انتظار

حسین، ناسٹلجیا، ماضی کی کربناکیوں کا شاہسوار اور ہند اسلامی تہذیب کی پرچھائیں کے طور پر اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ تقسیم سے قبل کا برِ صغیر، بنگلہ دیش کے قیام تک، 1965، 1971 کی جنگوں کا احوال، مہاجرت کا باطنی احساس، معاشرتی وسیاسی شعور اور گہری سماجی ذمہ داریاں، تاریخی و تہذیبی وژن، علامت، ہجرت، ماضی کی معنویت، تاریخ، مذہب، نسلی اثرات، دیومالا، حکایتیں، جاتک کہانیاں، عقائد، توہمات، ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تجربہ، چودہ سو سالہ تاریخی شعور، تہذیبی اقدار کا ماتم، تہذیبی جڑوں کی تلاش ایسے سروکاروں سے بحث کرتا ہے۔

گجرات سے تعلق رکھنے والے عبداللہ حسین [محمد خان: 14 اگست 1931ء تا 4 جولائی 2015] قرۃ العین حیدر کے ہم عصر تھے۔ ان کے والد متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ عبداللہ حسین اپنے والد کی پانچویں بیوی کی پہلی اور آخری اولاد تھے تین بہنوں کے اکلوتے بھائی اور ابھی چھے ماہ ہی کے ہوئے تھے کہ انکی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تقسیم برصغیر کے وقت تقریباً ۱۶ برس کے تھے تقسیم عبداللہ حسین کے لیے ایک بڑے واقعے اور سانحہ کی صورت سامنے آتی ہے۔ جس کے اثرات اور مابعد اثرات نے انہیں ناول میں سیاست، ریاست اور سماج کی مثلث پر مبنی ایسی کہانیوں کا تخلیق کار بنادیا جس میں تاریخی اور عصری شعور کی کارفرمائی بڑی نمایاں ہے۔

> ''اپنی وفات سے چند مہینے پہلے ایک فیس بک پوسٹ میں اپنے لڑکپن کے ایک تجربے کی روداد قلم بند کی تھی انکی یہ انگریزی تحریر اجمل کمال نے 'آج کراچی کے ایک شمارے نمبر 90) میں اپنے اردو ترجمے کے ساتھ شائع کی ہے۔ اپنی فکری اہمیت اور معنویت کے پیشِ نظر یہ تحریر اس لائق ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے عبداللہ حسین نے لکھا تھا۔
>
> 'میں پیچھے مڑ کر اس دور دراز صبح کی طرف دیکھتا ہوں جب میں اسکول کا لڑکا تھا اور رات بھر گولیاں چلنے کی آواز سنتا رہتا تھا ہم لڑکوں کی ایک ٹولی صبح تڑکے سائیکل چلایا کرتی تھی اسکول جانے کی بجائے ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے جاتے تھے۔ بنّوں سے آنے والی ٹرین کو جو ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کو انڈیا لے جارہی تھی، ان قبائلیوں نے روک لیا تھا جو کشمیر میں لڑنے کی غرض سے ہمارے شہر میں مقیم تھے اور وہ مسافروں کو ذبح کر رہے تھے۔ مقامی شہری بھی پوری توانائی کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے ہم نے اپنے ڈرائنگ ماسٹر کو دیکھا جو ایک شاعر اور گایک بھی تھا اور ہمارا آئیڈیل تھا۔ اس نے موٹے سے ایک آدمی کو زمین پر گرا رکھا تھا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی درزیوں والی قینچی اس کے جسم میں بار بار بھونک رہا تھا پھر اس نے اس آدمی کے کرتے کا سامنے والا حصہ پھاڑ کر اس کی سوتی بنڈی کی دونوں جیبیں، جو نوٹوں اور سونے کے

زیوروں سے بھری ہوئی تھیں،اسی قینچی سے کاٹ لیں،اس کے بعد ماسٹر سرور پیچھے دیکھے بغیر ،اپنے مالِ غنیمت کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا پورا پلیٹ فارم مرے ہوئے اور مرتے ہوئے انسانوں سے بھرا ہوا تھا۔میری عمر اس وقت سولہ برس کی نہیں ہوئی تھی۔

یہ صرف ہمارے خوابوں کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ دنیا کے ساتھ ہمارے رومانس کی بھی موت تھی ۔ہم میں سے کئی بعد میں خود کردہ جلاوطنی میں چلے گئے،چند ایک نہ لوٹنے کے لیے۔لیکن ہم جہاں بھی گئے ،ناخوش رہے،ہم ایک اکھڑی ہوئی گمشدہ نسل تھے۔۔۔۔لوگ اکثر ٹوٹے ہوئے دلوں کی بات کرتے ہیں لیکن اس نسل کے ادیبوں نے زخمی ذہنوں کے ساتھ لکھا ہم سب کے اندر اپنی اپنی جلاوطنی کی جگہیں موجود تھیں ' یہ کتنی گہری اداسی اور لاحاصلی کے احساس میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں اس اداسی نے اور لاحاصلی کے اس احساس نے زندگی بھر عبداللہ حسین کا پیچھا نہیں چھوڑا۔لہذا اس واقعہ پر ذرا بھی حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ انکی کہانیوں کا آخری مجموعہ جو اُردو میں سامنے آیا اس کا عنوان 'فریب' ہے یہ عام تجربوں پر مبنی زندگی کی کہانیاں ہیں!''[۱۲]

عبداللہ حسین کے متعلق اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ یہ اردو ادب کا وہ ناول نگار ہے جو اپنی قد آور شخصیت کے باجود اردو ادبی منظر نامے سے ہمیشہ پرے رہے۔وہ ایک مجلسی انسان نہیں تھے،لیکن کشادہ قلبی،انسان دوستی ،لطیف حسِ مزاح،روشن خیالی،آزادہ روی،انکی شخصیت کو غیر معمولی صفات کا حامل بنانے والی خوبیاں تھیں۔گفتگو میں محتاط لیکن اپنی ظاہری وضع قطع سے بے نیاز ایک ایسا ادیب جسے لوگوں کے دوہرے معیارات حیران بھی کرتے تھے اور بعض اوقات جھنجلاہٹ میں بھی مبتلا کر دیتے تھے۔

عبداللہ حسین کے تاریخی تناظرات اور مہاجرت،عالمی جنگوں، تقسیم ہند اور فسادات کے اس خطے پر اثرات، ملٹرائزیشن کا عمل ان کے ناولوں اداس نسلیں باگھ اور نادار لوگ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے عبداللہ حسین کا تاریخی و تہذیبی شعور ہند مسلم کلچر کے اشتراک کی تاریخی داستان، برصغیر پاک و ہند کا تحریکِ آزادی کے تناظر میں سماجی و تاریخی جائزہ، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم، تقسیمِ بر صغیر کی نسل کی ہیجان خیزی ۔نینشلزم اور کمیونلزم کی جدلیات،معاشرتی ناانصافی و عدم مساوات کے تناظر میں شہری و دیہی زندگی کا تضاد،جہالت مفلسی،انسانی جبر و قہر،غربت و افلاس کے سائے تلے سسکتی زندگی، صنعتی انقلاب،جمود اور قناعت،انگریزوں کی ریشہ دوانیاں،جنگِ آزادی کا شور،خوں ریزی،ہجرت،بیگانگی جبکہ ناول باگھ میں ضیاء کا دور سیاہ، ظلم،زیادتی اور جبر،خوف و دہشت کے

سائے، تاریخ کا نوحہ، نادار لوگ میں پاکستان کی متوازن تاریخ، سیاسی بحران، مصلحت کوشی، معاشرتی مغائرت و تفاوت کا آئینہ دار، رائیگانی کا ہمہ گیر احساس جیسے عناصر کو پیش کیا گیا ہے۔

دریائے چناب کے کنارے پر واقع ضلع گجرات کے قصبہ جو کالیاں میں پردادا محکم دین، دادا چودھری امیر بخش کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھنے والے جاٹ (تارڑ) برادری سے تھے آبائی پیشہ کاشتکاری تھا۔ پرکھے انکے سکھ تھے جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا، مستنصر حسین تارڑ [یکم مارچ 1939] کے والد کا نام چوہدری رحمت علی خان اور والدہ کا نام محترمہ نواب بیگم تھا۔ چھ بہن بھائیوں [مستنصر حسین تارڑ، زبیر حسین تارڑ، کرنل مبشر حسین تارڑ، پروین منظور، شاہدہ الطاف، شائستہ ذوالفقار] میں مستنصر حسین پہلے نمبر پر ہیں۔ دنیا کے تقریباً تمام قابل ذکر مقامات اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے بالخصوص سفر کیے۔ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ مختلف ڈراموں میں اداکاری کی، کمپئیرنگ اور الیکشن ٹرانسمیشن بھی انکے تجربات کا حصہ بنے۔ اردو دنیا کے بڑے اور بیسٹ سیلر ادیب۔ سنگِ میل پبلی کیشنز ان کا مستقل اشاعتی ادارہ ہے۔ مطالعہ ان کا بہت وسیع ہے مطالعہ کی یہ عادت ہنوز برقرار ہے۔ کہ جس میں تاریخ، ادب، جغرافیہ، تصوف، بشریات اور فلسفہ بالخصوص شامل ہیں۔ اس وقت دنیا کے کلاسیکل لٹریچر میں تمام اہم ناموں کی تخلیقات ان کے مطالعہ میں شامل ہیں بالخصوص ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ادب کے نوبل پرائز ونر تخلیق کاروں اور تخلیق کا مطالعہ کیا جائے اس کے علاوہ فلم اور تھیٹر سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی وسعتِ مطالعہ، متنوع تجربات اسے رومان اور راکھ کے بیچ اسیر بنائے ہوئے ملتے ہیں رومان انگیز طاقت ور بیانیہ، اداسی، فنا کا احساس، موت کا مستقل کردار، تہذیبی زوال کو دریاؤں کی خشکی کی متھ سے بیان کرنے کی کوشش کی، پرندوں اور موت سے تخلیقی کائنات کو مزین کرتے ہیں، سماجی جبر، آمریت، وقت کی تند و تیز دھار، انڈس تہذیب کے مختلف گوشوں کی دریافت، پنجابی اور دراوڑی تہذیب سے نسبت کا تفاخر، لاہور شہر، رنجیت سنگھ، پنجاب کے تہذیبی ورثے میں سکھوں کی عملدری پر بطور خاص نگاہ کرتے ہیں بہاؤ کو استعارہ بنایا ہے خشک ہوتا ہوا دریا اور پاکستان کا منظر نامہ راکھ: پھولوں کے شہر کی کایا پلٹ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ تاریخی بصیرت، سقوط بنگال کا گھاؤ، عصری تباہی غزال شب میں توقعات و پیمان کی خوں ریزی، برصغیر خصوصاً پاکستانی پنجاب کے 'انقلابیوں' کی روس کے بکھراؤ کے بعد وطن کی طرف دل شکستہ مراجعت لیکن واپسی کے مسدود راستے اس کے ناولوں کے موضوعات ہیں۔

حسن منظر [4 مارچ 1934] کا پہلا ناول العاصفہ 2006ء میں مرزا اطہر بیگ کے ناول غلام باغ، شمس الرحمن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سر آسمان' کے ساتھ ہی منظرِ عام پر آیا۔ اگلے ایک عشرے میں ان کی کئی تحریریں ،افسانوی مجموعے اور چھے مزید ناول منظر عام پر آئے۔ 1934 کو گداپاڑہ ضلع ہاپوڑ میں پیدا ہونے والے حسن منظر کی

تحریریں فنی و فکری خصائص کے ساتھ ساتھ گہری تاریخی بصیرت اور عصری حساسیت کی حامل ہیں کہ حسن منظر کا عہد ملکی اور بین الملکی ہر دو سطح پر تیز رفتار تبدیلیوں کا عہد رہا۔ انقلاب روس، مارکسزم، سوشلزم، فاشزم، کیپیٹل ازم، نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ اور مابعد نو آبادیاتی نظام، فکری سطح پر اذہان کو دعوتِ تفکر دے رہے تھے تو پہلی عالمی جنگ کی ہولناکیوں سے انگشت بدنداں دنیا اگلی عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی تھی برصغیر میں بیک وقت دو دھارے فکری سطح پر رواں دواں تھے۔ ایک طرف علم، شعور و تہذیب کی روشنی سے برصغیر کے اذہان روشناس ہو رہے تھے تو دوسری طرف انتہا پسندانہ سوچیں فرقہ واریت کو ہوا دے رہی تھیں ادبی سطح پر انگارے شعلے اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادبی منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ حسن منظر جس ادبی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں وہاں فکر کے دھارے پریم چند ،ٹالسٹائی، دستوفسکی، ٹیگور کے ساتھ ساتھ دیگر مغربی بالخصوص روسی ادیبوں کے مطالعہ سے تقویت پا رہے تھے۔ قرآن پاک کے مختلف زبانوں میں کیے گئے تراجم کا مطالعہ بھی جم کر کیا تو دیوان غالب بھی ہمرکاب رہا ہمیشہ۔ پاکستان کے مختلف خطوں بالخصوص لاہور کراچی میں رہے اور حیدر آباد کو بھی اپنا مسکن بنایا 1960 کی دہائی میں ملک سے باہر رہے تقریباً دس سال کا عرصہ مختلف ممالک افریقہ، یورپ اور مشرقِ وسطی میں گزارا۔ ہجرت بھی کی اور اس تجربہ کا مشاہدہ بھی لیکن ہجرت کا موضوع ان کے ہاں جنس، سیاست یا تقسیم کے حوالے سے نہیں ہے جیسا کہ ان کے دیگر ہم عصر لیکن سینئر فکشن نگاروں کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حسن منظر کے ہاں تنوع وہ عنصر ہے جو انکی تخلیقات میں شناخت کیا جا سکتا ہے یہ تنوع ان کے ہاں موضوعات میں، لوکیل میں، کرداروں کے چناؤ میں یہاں تک کہ زبان اور اسلوب کی سطح پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا ٹریٹمنٹ کچھ ایسا ہے کہ اجنبی کردار، ماحول، زبان، معاشرت، تہذیب کے باوجود ان کرداروں کی ابتلائی، ان کی خوشیاں پریشانیاں سب ویسی ہوتی ہیں جیسی دوسری جگہوں کی اس لیے ان کے ان کرداروں سے اجنبیت کا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا۔

دھنی بخش کے بیٹے۔۔۔انسان اے انسان: ایک متین اور معتبر دنیا کی کامل عکاسی، مشاہدے کی وسعت، فکر کی گہرائی تجربے کا تنوع، سندھی سرزمین میں وڈیرہ شاہی میں پنپتے نظام کے اندر عورت کے سماجی، جنسی استحصال، معاشرے کے ٹھہراو ¿، زوال، اور مقتدر طبقات کی ذہنی زبوں حالی کی عکاسی کرتا ہے، جبکہ انسان اے انسان میں حسن منظر نے تقسیم سے ذرا قبل کا منظر نامہ، مسلم پیورٹن رویے کا منفی رویہ، نئی نسل کے کردار کی کجی میں بے جا سختی ،نئے پاکستانی سماج میں کرپشن اور ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کی ریس، مذہبی ادارے کی نئی جنم لیتی صورت ان کے یہاں برتے جانے والے موضوعات ہیں۔

العاصفہ۔ مسلم دنیا کی سچائیوں بالخصوص بر صغیر پاک و ہند کے اس خطہ کی ترجمانی، دھوکہ اور منافقت پر مبنی سماج کی نقاب کشائی بیر شیبا میں ایک یہودی نرس اور اس کے لاشعور میں موجود ہولوکاسٹ کی معنویت جبکہ حبس میں حسن منظر نے عرب اسرائیل تنازعے میں سفید ہاد، یورپیوں کی دوہری منافقت اور تضاد پر مبنی سیاسی فتنہ طرازیوں کو بھی بے نقاب کیا اور مسلم دنیا کی بے حسی کو سمجھنے اور ہائی لائیٹ کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ اردو کے یہ چند نمائندہ ناول نگار ہیں جن کے فکشن کو انکے عہد، انکے خانگی حالات، تعلیم، تجربات حیات ماضی قریب و بعد کے مطالعے سے سمجھنے کی کاوش کی گئی ہے ان ناول نگاروں نے تقسیم کے المیے کو اپنی تمام تر گہرائی کے ساتھ نہ صرف محسوس کیا بلکہ منتخب معاشرے میں بنیادی اداروں کے کردار پر اعتماد کا اظہار نہ کرتے ہوئے اس معاشرے کی تنزلی کے اسباب کو سمجھنے کی کاوش کی۔ جنس، مذہب، سزا و جزا، سیاسی مصلحت کوشیوں، ازلی ابدی انسان کو ان کے ساتھ نبرد آزما ہوتے بھی دیکھا اور زندگی سے ہٹ کر یاسیت، واماندگی کا کھوج لگانے کی بھی سعی کی۔ یہ ناول سیاسی سماجی اور مقتدر بیانیہ پر مبنی تاریخ کے بین ایک متوازن تاریخ و شعور کی راہ بھی دکھلاتے ہیں اور کچھ سوالوں کو جنم دیتے ہیں البتہ ان کا جواب اپنے قاری سے طلب کرتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، ناول کا نیا فن، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2018، ص11/12

۲۔ علی احمد فاطمی، پرفیسر، ''ایک چادر میلی سی'' کا سماجی اور تہذیبی مطالعہ مشمولہ مکالمہ، اکادمی بادیافت، کراچی، سال نامہ 218، ص نمبر372

۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ ''کتاب نگر ملتان، 2017ص220

۴۔ آنند ،ستیہ پال ،شوکت صدیقی ایک سوانحی مونتاژ مشمولہ ''جدید ادب''شمارہ 13جولائی تا دسمبر 2009، ص302

۵۔ شوکت صدیقی افکار و شخصیت، مرتبہ نثار حسین، رکتاب پبلی کیشنز، 2014،، ص147

۶۔ ایضاً، ص60/61

۷۔ شوکت صدیقی افکار و شخصیت، ایضاً، ص111

۸۔ جعفر احمد، سید، ڈاکٹر، مقدمہ مشمولہ، شوکت صدیقی افکار و شخصیت، ایضاً، 2014، ص14/15

۹۔ محمد عمر میمن، انتظار حسین ایک بات چیت مشمولہ' انتظار حسین ایک دبستان، ترتیب ڈاکٹر ارتضٰی کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی1996، ص50، عقیدے کے اعتبار سے اہلِ تشیع تھے، والدہ انکی صغریٰ بیگم ایک گھریلو لیکن نفیس مزا

۱۰۔ آصف فرخی، ایضا، ص22

۱۱۔ محمد عمر میمن، ایضاً، ص50

۱۲۔ شمیم حنفی، عبداللہ حسین کو یاد کرتے ہوئے ،مشمولہ دنیا زاد ،کتابی سلسلہ 43، کراچی، 2016، ص241/242